ڈاکٹر آفتاب اصغر

برصغیر کے قدیم اسلامی کتب خانے

یوں تو تصنیف و تالیف اور واقعات و حالات کا ریکارڈ رکھنے کا آغاز مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی عمل میں آچکا تھا مگر کتاب نویسی، کتاب خوانی اور کتاب اندوزی کی روایات کی باقاعدہ بنیاد اموی دور (۴۱ - ۱۳۲ھ) میں رکھی گئی۔ خلافتِ بنوامیہ کے بانی حضرت امیر معاویہؓ کا پوتا خالد جو کہ خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا، تاریخِ اسلامی میں کتب خانوں کی عظیم روایت کا بانی تھا[1] محمد بن قاسم کے سرپرست خلیفہ ولید بن عبدالملک اور اس کے والد عبدالملک بن مروان نے بھی کتابوں کی جمع آوری کے کام پر خصوصی توجہ دی، ان کے بعد آنے والے بعض دیگر اموی خلفا مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز، ہشام بن عبدالملک اور ولید بن یزید نے بالترتیب سیرت و حدیث، مغازی و مناقب، تاریخ و تفسیر، طب و فلسفہ اور دیگر علومِ متداولہ پر کتابیں منگوائیں اور حکومت کے مرکزی کتب خانے کی زینت بنائیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اس دور میں مفتوحہ ممالک کی زبانوں مثلاً پہلوی، سریانی، عبرانی اور قبطی زبان کی کتابوں کے عربی تراجم کے ذریعے بھی کتابی ثروت میں اضافہ ہوا۔

عباسی دور (۱۳۲ - ۶۵۶ھ) میں اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا وہ پودا اور بھی پھلا پھولا جو کہ درحقیقت اموی دور میں لگایا گیا تھا۔ منصور، ہارون اور مامون جیسے علم دوست خلفا اور ان کے برامکہ جیسے دانش پرور وزرا کی شاہانہ سرپرستیوں اور زر پاشیوں کے باعث اس دور میں ذوقِ کتاب خوانی اور شوقِ کتاب اندوزی خواص کے حلقوں سے نکل کر عوام کے حلقوں میں بھی سرایت کر گیا۔ عباسی خلفا کی سرپرستی و قدردانی کے باعث کتاب اندوزی کے ساتھ ساتھ کتاب افروزی سے متعلق فنون مثلاً کاغذ سازی، روشنائی سازی، جلد بندی، حاشیہ نگاری، نقاشی، مصوری اور طلاکاری جیسے فنونِ لطیفہ اور ہنرہائے زیبا نے بھی اسلامی ثقافت کے اس طلائی دور میں غیر معمولی ترقی

---

[1] علامہ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی - ج ۶، ص ۸۶

پیش رفت کی۔ منصور نے دارالترجمہ کی بنیاد رکھی، جہاں حنین بن اسحاق اور یعقوب الکندی جیسے زبان دانوں نے یونانی، سنسکرت، پہلوی، قبطی اور لاتینی زبانوں کی متعدد کتابوں کے عربی میں تراجم کیے۔ اس کے پوتے ہارون نے بیت الحکمت کے نام سے غالباً دنیا کا سب سے پہلا عوامی کتب خانہ قائم کیا[۵۲] اور ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید نے، جو اس خاندان کا سب سے عالم فاضل خلیفہ تھا، بیت الحکمت کی مزید توسیع کی۔ فلسفہ، ریاضی اور ہیئت و نجوم جیسے علوم پر خاص توجہ دی اور بیت الحکمت کو دنیا بھر کے علم و حکمت کے موتیوں سے بھر کر بیت المعمور بنا دیا۔ اس نے بقول جرجی زیدان آثار ارسطو کے مترجمین کو ان آثار کے ہم وزن مقدار میں سونا بطور انعام دیا۔ اس یاقل اور جواد خلیفہ کی زر بخشیوں کے نتیجے میں کتاب اندوزی یا ارتکازِ کتب ایک ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ بقول عمر ابوالنصر مصنف الہارون[۵۳] اس عہد میں بغداد کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو کتب خانے سے خالی اور کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کتب اندوزی کے ذوق سے عاری ہو۔[۵۴] یہ تحریک صرف بغداد تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح سارے عالم اسلامی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا خاص طور پر عباسی قلم رو میں کوئی ملک ایسا نہ تھا جس میں جا بجا کتب خانوں کا قیام عمل میں نہ آیا ہو۔

وطنِ عزیز پاکستان کا صوبۂ سندھ، وہ علاقہ ہے، جو برصغیر میں سب سے پہلے دمشق اور پھر بغداد جیسی کتاب دوست اور دانش گستر اسلامی حکومتوں کے زیرِ انصرام آیا۔ جب ۱۳۲ھ میں خلافت امویوں کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے ہاتھوں منتقل ہو گئی تو یہ علاقہ بھی عباسی عمال کی عمل داری میں آ گیا۔

چوں کہ اموی دور میں کتب خانوں کے قیام کی روایت خاصی مستحکم ہو چکی تھی اور عباسی دور میں گھر گھر کتب خانے قائم ہو چکے تھے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اموی اور عباسی ادوار میں سندھ میں، ہر چند کہ یہ ایک دور افتادہ اور از نظر افگندہ صوبہ تھا، کتب خانوں کا قیام عمل میں نہ آیا ہو، پھر اس نواح کی اسلامی حکومت کا مؤسس محمد بن قاسم، جو خود بھی ایک شاعر، ادیب، عالم اور ذوقِ مطالعہ سے سرشار طبیعت کا مالک

---

۵۲ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ج ۲، ص ۱۰۴۵

۵۳ محمد ابوالنصر، الہارون (اردو ترجمہ از شیخ محمد احمد)، ص ۲۲۱

تھا، اشاعتِ علم و دانش سے متعلق اس اہم کام یعنی کتب خانوں کے قیام سے کیسے غافل رہ سکتا تھا۔ بلاذری، اصطخری، مسعودی اور مقدسی جیسے مؤرخوں، جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے سندھ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر افسوس کہ انھوں نے یہاں کے ثقافتی اداروں کی تفصیل زیادہ نہیں دی۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی نے سندھ شناسی کے موضوع پر نہایت وسیع کام کیا ہے مگر ہنوز ——— "ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است۔" بہرحال یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ اس دور میں سندھ میں کتب خانے موجود تھے، خواہ وہ اپنی ابتدائی صورت و ہیئت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کتب خانے اکثر و بیشتر مساجد میں قائم ہوتے تھے، کیوں کہ اسلامی تاریخ میں مسجد کو شروع سے ہی ایک مرکزی اور اہم ترین تعلیمی اور تربیتی ادارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمان، فاتح یا تاجر یا مبلّغ، غرض جس حیثیت میں جہاں بھی گئے، وہاں انھوں نے سب سے پہلے سنتِ نبوی کے مطابق اسلامی تہذیب و ثقافت کی خشتِ اوّل رکھ دی یعنی مسجد قائم کر دی۔ ادھر مسجد بنی، اُدھر گویا دبستان کھل گیا۔ محمد بن قاسم نے بھی مسلم فاتحین اور مبلّغین کے دستور کے مطابق مساجد کی تعمیر کے کام کو اوّلیت دی اور بقول مؤلف چچ نامہ یا فتح نامہ سندھ، حکم صادر کیا "ہر جا کہ موضعی است قدیم و قصبہ و شہری نامدار مساجد و منابر بنا کنند"[۴۲] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اس فرمان کے نتیجے میں سندھ کے معروف شہروں مثلاً دیبل، برہمن آباد، نیرون، ملتان، بھروچ وغیرہ میں مساجد کے ساتھ ساتھ حسبِ معمول مدارس اور مدارس کے ساتھ ساتھ کتب خانے بھی ضرور وجود میں آئے ہوں گے۔ کیوں کہ اس زمانے میں مسجد، مدرسہ اور کتب خانہ لازم و ملزوم ہوا کرتے تھے۔

یوں تو خلافتِ عباسیہ ۶۵۶ ہجری تک قائم رہی مگر مامون الرشید کے بھائی معتصم عباسی کے بعد سندھ کا بغداد سے تعلق بتدریج سست پڑتا گیا۔ بالآخر عملاً یہ تعلق ٹوٹ گیا اور یہاں ملتان اور منصورہ میں دو نیم خود مختار اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں جو سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں فتح سندھ تک بلسا طبھر پرورشِ لوح و قلم میں مصروف رہیں۔ چوتھی صدی ہجری تک یہاں آنے والے عرب سیاحوں نے ان دونوں علم پرور ریاستوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ ان کے بیان سے صاف عیاں ہے کہ اس دور

۴۲۔ علی بن حامد کوفی، فتح نامہ سندھ (چچ نامہ)، ص ۲۴۰

میں یہاں بیسیوں عالم ظہور پذیر ہوئے، جن میں سے معروف تر ابو معشر سندھی، ابو عطا سندھی، ابراہیم دیبلی اور ابو محمد داؤد منصوری ہیں۔ اس دور میں علما کی کثرت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں سرکاری، غیر سرکاری اور شخصی کتب خانے بھی کثیر تعداد میں موجود ہوں گے، کیوں کہ بے کتاب عالم ایسے ہی ہوتا ہے جیسے بے تیغ سپاہی۔ منصورہ کی علمی زندگی کے بارے میں مسعودی لکھتا ہے:

"اہلِ علم یہاں بہت زیادہ ہیں"[۵۵]

اور مقدسی کا بیان ہے:

"میں نے قاضی ابو محمد منصوری کو دیکھا۔ ان کا حلقۂ درس ہے اور بہت سی اچھی تصنیفات ہیں"[۵۶]

غرض اس دور میں اصحابِ تصنیف علما و فضلا، مساجد اور حلقہ ہائے درس کی موجودگی کتب خانوں کے وجود پر دال ہے۔

سندھ میں ملتان اور منصورہ کی علم پرور ریاستوں کے سقوط کے ساتھ برصغیر کی سیاسی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کا وہ عظیم الشان دور شروع ہوا جس کو اگر عصرِ محمود کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ دور سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی (۳۸۷ھ) سے شروع ہو کر اس کی وفات (۴۲۱ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں اس کے معاصر شاعر فرخی سیستانی نے بجا طور پر کہا تھا۔

"فسانہ گشت و کہن شد حدیثِ اسکندر سخن نو آر کہ نور حلاوتیست دگر"

غلط نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ سلطان محمود غزنوی کی عسکری فتوحات اور اس کی زیرِ سرپرستی البیرونی کی علمی فتوحات نے اسکندرِ اعظم کی عسکری اور اس کے استاد ارسطو کی علمی فتوحات کو ماند کر دیا تھا۔ محمود ایک بلند پایہ عالم تھا اور اہلِ علم کا اتنا بڑا قدر دان کہ دنیائے علم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے ملک الشعرا عنصری کے تموّل اور ثروت مندی کے قصے آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ بات بات پر لاکھوں بخش دینا اس کے لیے ایک معمولی چیز تھی۔ البیرونی، بیہقی، عتبی، عنصری اور فردوسی جیسے علما و شعرا، جو کہ آسمانِ علم و ادب کے روشن ترین ستارے تھے، اس کے دربار کی

---

۵۵ مسعودی، مروج الذہب۔ ج ۱، ص ۳۷۹

۵۶ مقدسی، احسن التقاسیم، ص ۴۷۹

زینت تھے ۔ وہ جہاں کہیں کسی اہلِ علم کی خبر پاتا، اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سر ایڈورڈ براؤن نے اسے "اغوا کنندۂ بزرگ رجالِ ادبی"[7] کے نام سے یاد کیا ہے ۔ اس کی علمی سرپرستیوں کی وجہ سے اس کا دارالسلطنت غزنی اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا تھا۔ اس نے ایک طرف دیالمہ اور سامانیوں کی دم توڑتی ہوئی سلطنتوں کو سلطنتِ غزنی میں ضم کیا اور دوسری طرف موجودہ پاکستان، مشرقی پنجاب اور کشمیر کو غزنوی سلطنت میں جذب کرکے اس پورے منطقے کو ایک سیاسی اکائی اور ثقافتی وحدت میں تبدیل کر دیا۔ رے اور بخارا پر قبضے کے نتیجے میں ۴۲۰ھ دیلمی، مشہور دیلمی وزرا، ابن عمید اور صاحب بن عباد اور نوح بن منصور سامانی کے شہرۂ آفاق کتب خانے، جو انھوں نے خون پسینہ ایک کرکے جمع کیے تھے، اس کے ہاتھ آئے، جس کی مدد سے اس نے غزنی میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا[8]۔ اس علم پرور اور دانش گستر سلطان نے غزنی میں ایک عظیم دانش گاہ قائم کی اور اپنے ممالکِ محروسہ کے تمام شہروں غزنی، کابل، قندھار، ہرات، بلخ، بخارا، نیشاپور، ملتان، منصورہ، ٹھٹھہ، اوچ، پشاور، لاہور اور سیالکوٹ وغیرہ میں مدرسوں اور کتب خانوں کا جال بچھا دیا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں :

"قطار در قطار علما، بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے چلے آ رہے تھے ۔ اس زمانے میں ان اطراف سے آنے والوں کو سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا، اس لیے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا ۔ ملتان اور سندھ کے بعد ان کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوئی ۔"[9]

محمود غزنوی کے زمانے میں مشہور عالمِ دین مولانا صفی الدین گازرونی نے اوچ میں ایک درس گاہ قائم کی، جس میں ڈھائی ہزار طالبانِ علم اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے[10]۔ ظاہر ہے کہ سرچشمۂ علم یعنی کتب خانے

---

[7] E. G. Browne, A Literary History of Persia, vol II, p 95

[8] محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۱۳۰

[9] بحوالہ الحاج محمد زبیر، اسلامی کتب خانے، ص ۳۲۹

[10] ایضاً، ص ۳۹۸

کے بغیر ایسا ممکن نہ تھا۔

سلطان محمود غزنوی کا فرزندِ ارجمند مسعود غزنوی حربی میدان میں تو نہیں البتہ ادبی میدان میں اس کا خلف الرشید تھا۔ البیرونی کی قانونِ مسعودی اور بیہقی کی تاریخ آلِ سبکتگین یا تاریخِ مسعودی اسی کے نامِ نامی سے معنون ہے۔ اس کو اشاعتِ علم و ادب اور فروغِ فرہنگ و ثقافت سے اس قدر گہری وابستگی تھی کہ اس نے بہ قولِ فرشتہ "مقبوضہ ممالک کے تمام شہروں میں اس قدر مدارس و مساجد بنوائے کہ زبان ان کی تعداد بتانے سے معذور اور قاصر ہے۔"[1]

غزنوی دور تاریخِ برصغیر میں سیاسی، علمی اور تمدنی لحاظ سے ایک نہایت اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ابتدائی حکمرانوں، البتگین اور سبکتگین نے برصغیر میں اسلامی فتوحات کی وہ کڑی جو یہاں کی اسلامی سلطنت کے مؤسسِ اوّل محمد بن قاسم کی معزولی نے توڑ دی تھی از سرِ نو جوڑ دی۔ مؤسسِ دوم سلطان محمود غزنوی نے اپنی پے در پے یلغاروں سے واقعات و حالات کا دھارا ایک بار پھر یہاں کے مسلمانوں کے حق میں موڑ دیا اور پنجاب و سندھ پر مستقل قبضہ کر کے موجودہ پاکستان کے لیے میدان کو مزید ہموار کیا۔ مؤسسِ ثالث سلطان شہاب الدین محمد غوری کی آمد (۵۸۲ھ) تک تقریباً دو سو سال تک غزنویانِ پاکستان یعنی سلطان محمود غزنوی کے مودود، ابراہیم، بہرام اور خسرو ملک جیسے فرہنگ دوست اخلاف نے، جو کہ غزنی سے رابطہ منقطع ہو جانے کے باعث یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے، یہاں اسلامی تہذیب و تمدن کی قندیلیں فروزاں رکھیں اور اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کے نتیجے میں اس پاک سرزمین کو اس قدر منور کیا کہ مورخین نے اس کے پایۂ تخت لاہور کو "غزنۂ خرد" کا باعث صد افتخار لقب دیا۔ اس دور میں بلخ، بخارا، سمرقند، ہرات اور غزنی جیسے اسلامی تہذیب و تمدن کے عظیم گہواروں کے پروردہ اور سربرآوردہ علما کا ایک سیلِ تند رو تھا جو سمتِ لاہور رواں دواں تھا۔

اسی دور میں شیخ اسمٰعیل صوفی نے لاہور میں اپنا حلقۂ درس قائم کیا، جس سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے۔ اسی دور میں شیخ علی ہجویری نے ہدایت و ارشاد کا سرچشمہ جاری کیا اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب کشف المحجوب پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ اسی عہد میں البیرونی نے اپنی کتاب تحقیق ماللہند لکھ کر

---

[1] محمد قاسم فرشتہ، تاریخِ فرشتہ، ص ۱۸۳

جریدۂ عالم پر اپنا نقشِ دوام ثبت کیا۔ اسی زمانے میں مسعود سعد سلمان لاہوری نے فارسی اور ترکی کے علاوہ اردو زبان میں بھی اپنا دیوان مرتب کیا۔ مشہور زمانہ صوفی شاعر سنائی غزنوی نے، جن کے بارے میں مولانا روم نے فرمایا تھا:

" عطار روح بود و سنائی دو چشم او، ما از پی سنائی و عطار آمدیم "

اپنی یکتائے روزگار مثنوی "حدیقۃ الحقیقت" اسی عصر میمنت اثر میں لکھی تھی۔ ڈاکٹر اکرام مرحوم اسی دور کے ایک دانش دوست وزیر ابو نصر فارسی کے متعلق لکھتے ہیں:

" وہ علم وفضل کا مربی تھا۔ اس نے لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی جو اہلِ علم اور دوسرے بزرگوں کی جائے پناہ تھی اور آہستہ آہستہ لاہور میں بلخ و بخارا اور دوسرے ممالک سے اہلِ علم کھنچ کھنچ کر آنے لگے [۱۲]"

یاد رہے اس دور میں قائم ہونے والی درگاہوں اور خانقاہوں کے ساتھ بھی کتب خانے ملحق ہوا کرتے تھے۔ اس ضمن میں شیخ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا، بابا فرید گنج شکر اور حضرت علی ہجویری کی خانقاہوں کے ساتھ بالترتیب دہلی، اجمیر، دہلی، پاک پتن اور لاہور میں کتب خانے بھی ملحق تھے۔

غرض اس دور میں آج سے تقریباً ہزار سال پہلے ہی متذکرہ بالا دانش وروں اور دانش پروروں کی مساعیِ جمیلہ کے باعث لاہور ایک بہت بڑے کتاب گھر میں تبدیل ہوگیا تھا اور آج خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے تقریباً ایک ہزار سال بعد بھی یہ خطہ اسلامی کتب خانوں کی کثرت کے اعتبار سے برصغیر کے سب سے بڑے مراکز میں شمار ہوتا ہے۔

غزنویانِ پاکستان کے خانوادہ کے آخری تاجدار خسرو ملک کی معزولی کے ساتھ ۵۸۲ھ میں برصغیر کی اسلامی تاریخ نے ایک بار پھر کروٹ بدلی اور یہاں کی سیاست و ثقافت کی سیادت غوری سلاطین کا مقدر بنی۔ غور اور فیروزکوہ کے سلطان غیاث الدین غوری کے چھوٹے بھائی شہاب الدین غوری نے غزنویانِ افغانستان کے تمام علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد مزید آگے بڑھ کر درۂ خیبر کے اس پار غزنویانِ پاکستان کے تمام علاقے پر بھی قبضہ کرلیا۔ پھر موجودہ پاکستان کو بیس کیمپ بنا کر مزید پیش قدمی کی اور دہلی فتح کرکے

---

[۱۲] ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، ص ۶۴

اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت بنایا۔ اس کے عساکرِ قاہرہ نے اس کی زیرِ ہدایت قنوج و اجمیر کو فتح کر کے محمد بن قاسم کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا اور بنگال و بہار کو بھی غوری قلمرو کا جزوِ لاینفک بنا دیا۔

اس کی شہادت کے بعد ۶۰۲ھ میں قطب الدین ایبک نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس کے آقا سلطان شہید محمد غوری کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمود غوری نے خطِ آزادی اور حریت و استقلال کے علائم و آثار یعنی چتر و دور باش بھیج کر اس کو برصغیر کے اسلامی مقبوضات کا مطلق العنان اور خود مختار سلطان تسلیم کر لیا۔ یوں ۶۰۲ھ میں برصغیر میں ایک مستقل اور مکمل طور پر آزاد اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی جو ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں یہاں پر تیموری سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کے برسرِ اقتدار آنے تک استوار اور برقرار رہی۔

علم و دانش اور تہذیب و تمدن کی جو شمع غزنویانِ افغانستان اور پھر غزنویانِ پاکستان نے تقریباً دو سو برس تک یہاں اپنے خونِ جگر سے روشن رکھی، اس کی روشنی سلطان محمد غوری نے شمالی ہند کے علاوہ بنگال و بہار کے ظلمت کدوں میں بھی پھیلا دی۔

سلطان محمود غوری بھی اپنے عظیم پیش رووں، محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کی طرح نشرِ فرہنگ و ثقافت اور اشاعتِ علم و دانش سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کی علمی اور تمدنی فتوحات اس کی بے پناہ سیاسی فتوحات کے انبار تلے اس بُری طرح سے دبی ہوئی ہیں کہ انھیں کرید کرید کر نکالنے کے لیے بہت فرصت اور محنت کی ضرورت ہے، تاہم اس نے اپنے خرید کردہ اور پروردہ غلاموں یعنی امرائے چہل گان کی تربیت جس اعلیٰ معیار پر کی، اس سے اس کی فرہنگ گستری اور دانش پروری صاف ظاہر و آشکار ہے۔ اس کے تربیت کردہ پانچ غلاموں، سلطان قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التتمش، ناصر الدین قباچہ، تاج الدین یلدوز اور محمد بختیار خلجی نے دہلی، بدایوں، سندھ، غزنی اور بنگال و بہار میں مدارس اور ملحقہ کتب خانوں کے قیام کے سلسلے میں جو کوشش و کاوش کی بالواسطہ طور پر اس کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ اس علم پرور سلطان نے جو کہ علم و ادب کے فروغ کی نہایت درخشاں غزنوی روایات کا محافظ و امین تھا، ان روایات کو اور آگے بڑھایا اور پاکستان قدیم اور شمالی ہند کے نو مقبوضہ علاقوں مثلاً لاہور، سیال کوٹ، دہلی، اجمیر اور قنوج وغیرہ میں مساجد و مدارس سے ملحق کتب خانے قائم کیے۔

مختصر یہ کہ کتاب اندوزی یا کتب خانوں کی تاسیس کی ہمہ گیر تحریک جو دورِ سلاطین (۶۰۲ - ۹۳۲ھ)

(باقی صفحہ ۲۲ پر)